

نے ان کو متعدد خطوط میں حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہنے کی ہدایت فرمائی، اس کی وجہ حضرت مفتی صاحب کی جلالتِ شان کے ماسوا سلسلہ طریقت کا اشتراک اور مناسبت بھی تھی، والد ماجد نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”نزہۃ الخواطر“ کی (جو آٹھ جلدوں میں عربی میں غیر منقسم ہندوستان کے ہزار بارہ سو سال کے اسلامی دور کے مشاہیر ہند اور ممتاز شخصیتوں کے تعارف و تذکرہ پر مشتمل ہے) آٹھویں جلد میں حضرت مفتی صاحب کا بلند الفاظ میں قدسے شرح و بسط کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ مجھے حضرت مفتی صاحب کی زیارت کا شرف تو حاصل نہیں ہوا، کہ ۱۳۲۷ھ میں آپ کی وفات ہو گئی، اور میں دیوبند ۳۱/۱۹۶۱ (۱۳۵۷ھ) میں حاضر ہوا، اور مولانا مدنی رحمۃ اللہ کے درس حدیث میں شرکت کی سعادت حاصل کی، دیوبند کے ایک سفر کے موقع پر مفتی صاحب کے عم محترم مولانا بشیر احمد صاحب عثمانی دیوبند ہی تشریف رکھتے تھے، مولانا مدنی کے دولت کدہ پر ان سے نیاز حاصل ہوا، پھر کئی بار دولت خانہ پر بھی حاضر ہوا، مولانا کے ان حواشی کے بارے میں جو حضرت شیخ الہند کے ترجمہ قرآن پر ان کے قلم سے ہیں، میں نے اپنے تاثرات اور بحیثیت مدرس تفسیر کے اپنے تجربہ کا اظہار کیا۔ اور ان کی افادیت اور علمی و تحقیقی امتیاز کے بارے میں اظہار خیال کیا، تو مولانا کی خصوصی توجہ ہوئی اور خصوصی شفقت فرمانے لگے، اس وقت تک جہاں تک یاد ہے مفتی عتیق الرحمن صاحب سے ملاقات اور تعارف کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

مفتی صاحب کے نیاز اور براہ راست ملاقات کا سلسلہ (جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے) ۱۹۴۷ء کے بعد سے شروع ہوا، جب حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ کی خدمت میں پہلی بار حاضری ہوئی اور پھر مستقل ربط قائم ہو جانے کی بنا پر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مدلی کا سفر پیش آتا رہا اس وقت تک مدلی کے نامور اور ممتاز علماء اور علمی اشتغال اور سیاسی ذوق رکھنے والے فضلا (حضرت مفتی کفایت اللہ

صاحب کو مستثنیٰ کر کے) مولانا سے زیادہ متعارف و مانوس نہیں تھے۔ اور ان کی نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی، میں اپنی بے بضاعتی اور کم مانگی کے باوجود دارالعلوم ندوۃ العلماء سے درس و تدریس کا انتساب رکھنے اور کچھ لکھنے پڑھنے کی مناسبت سے دہلی کے ان علماء اور مولانا کے درمیان رابطہ بننے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس وقت جامع مسجد پر مولانا سميع اللہ صاحب حرم کا مکتبہ عزیزیہ باذوق و سنجیدہ علماء اور علمی و سیاسی ذوق رکھنے والے اجاب کی (جن کا زیادہ تر جمعیۃ العلماء سے تعلق تھا) نشست گاہ اور بزم اجاب تھی، مولوی سميع اللہ صاحب کے اخلاق، خوش گفتاری اور زندہ دلی کی وجہ سے میری بھی آمد و رفت شروع ہوئی، وہاں مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی بھی تشریف لایا کرتے تھے، میں نے دونوں کو نظام الدین آنے کی دعوت دی، اور دونوں حضرات میری دعوت پر وہاں تشریف لائے، میں نے مولانا محمد الیاس صاحب حمۃ اللہ علیہ کے مفتی صاحب کے بارے میں بلند الفاظ سنے تھے، فرماتے تھے کہ ”حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب کو مفتی عتیق الرحمن صاحب کی فقہی صلاحیت اور نظر پر بڑا اعتماد تھا، اور وہ ان کے فقہی جوابات سے مطمئن ہوتے تھے، مجھے ان کا فقہ و افتاء کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول ہونا، اچھا نہیں معلوم ہوتا، کہ ان کو اس فن سے خصوصی مناسبت اور امتیاز حاصل ہے۔“

مفتی صاحب سے اصل ربط و تعلق ۱۹۶۴ء سے شروع ہوا، اس وقت ندوۃ المصنفین،، قردباغ دہلی میں تھی، حسن اتفاق کہ اس زمانہ میں اس کے مرکز کے قریب ہی میرے والد مرحوم کے ایک خلص دوست عم مخدوم و محترم الحاج سید محمد خلیل صاحب نہپوری مرحوم مقیم تھے، ان کے صاحبزادہ گرامی قدر برادر محترم سید محمد جمیل صاحب (جو بعد میں پورے پاکستان کے کانٹینینٹ جنرل ہوئے) ریلوے کے آڈیٹر تھے اور ایک زمانہ میں دہلی میں انکی پوشنگ تھی، اس تعلق و مناسبت سے میرا بار بار وہاں

آنا جانا ہوتا تھا، سید محمد خلیل صاحب اور سید محمد جمیل صاحب دونوں مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اور ندوۃ المصنفین سے ربط و تعلق رکھتے تھے، اسی زمانہ میں مولانا محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ جو حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی بانی مدرسہ و مصنف ”اظہار الحق“ کے خاندان کے چشم و چراغ اور آثار رحمۃ اللہ، میں سے تھے، بعض سیاسی حالات و مصالح کی بنا پر مکہ مکرمہ سے آکر قرولباغ دہلی میں اسی ماحول و جواریں جس کا تذکرہ کیا گیا مقیم تھے، یہیں سے وہ رسالہ ”ندائے حرم“ کی ادارت و اشاعت بھی فرماتے تھے۔ اور مدرسہ صولتیہ کی رہنمائی و نگرانی بھی، اتفاق سے انہیں دنوں ہمارے مخدوم مولوی ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی ایم۔ اے۔ علیگ بھی دہلی میں مقیم تھے اور ان کا زیادہ وقت یہیں گزرتا تھا، وہ مجھ پر خاص کرم فرماتے تھے، اور مجھے بھی ان سے بڑی موانست و مناسبت تھی، میں قرولباغ جاتا تو آدھے آدھے دن رہ جاتا، علم و ادب، زندہ دلی اور مجلس آرائی، چشم و گوش اور کام و دہن سب کی لذت سب کا سامان ایک جگہ ہم ہوتا مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب بھی شریک بزم ہوتے، انھوں نے کبھی اپنی قیام گاہ پر بلا کر کھانے کی ضیافت بھی فرمائی۔

اس کے بعد مفتی صاحب سے صرف اہم اجتماعات میں ملاقات ہوتی، مثلاً بمبئی کا علمی کنونشن جو مولانا حفظ الرحمن صاحب نے ۱۹۵۵ء میں بلایا تھا، تقسیم ہند کے بعد جمعیتہ العلماء کا پہلا جلسہ جو ۱۳۶۶ھ (اپریل ۱۹۴۸ء) میں مولانا مدنیؒ کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ اور اس کے اکثر مہمان دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مقیم تھے نومبر ۱۹۵۳ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا پاکستان میں حادثہ ارتحال پیش آیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہم نیاز مندوں نے مولانا کی یاد میں ۱۳۵۴ھ میں ایک سنجیدہ اور علمی اجتماع منعقد کیا، جس کی شرکت کے لئے ضعف و علالت کے باوجود مولانا سید

مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم اپنے وطن کھنوا تشریف لائے مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب اپنی شرافت نفس، سید صاحب کے ساتھ تعلقات اور دارالمصنفین ندوۃ المصنفین کے علمی ورسمی رشتہ و اشتراک کی بنا پر کیسے شرکت نہ فرماتے؟ تشریف لائے اور بڑے ذوق و دل چسپی کے ساتھ پورے اجتماع میں شریک رہے، سید صاحب کا ہندوستان کو خیر باد کہہ کر پاکستان تشریف لے جانا اور وہیں قیام اختیار کر لینا ایک علمی ادبی اور ملی سانحہ تھا، لیکن حالات اور مجبوریوں اور خانگی نزاکتوں کی ”سنگین منطق“ میں خصل در معقولات، کی کیا گنجائش؟ مفتی صاحب نے اپنے ہی تاثر نہیں بلکہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ اور علمی و تصنیفی اداروں کی اس ملی حیرت و حسرت کو جس خوبی ذہانت و لطافت کے ساتھ اپنی تعزیتی تقریر میں ادا کیا وہ مفتی صاحب ہی کا حق تھا، اور ذوق و گوش ابھی تک اس کی لذت لے رہے ہیں، مفتی صاحب نے فرمایا کہ ہم عقیدت مندوں اور نیاز مندوں کی تمنا تو یہ تھی کہ سید صاحب کی آخری آرام گاہ یا اپنے محبوب و محسن استاد و مرقی علامہ شبلی کے پہلو میں ہوتی، یا اپنے مرکز عقیدت شیخ و مرشد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے پہلو میں، مگر تقدیر الہی کچھ اور تھی۔

من چُتال خواہم خدا خواہد چنیس

آج بھی اہل ذوق اور محرمان حقیقت اس بلیغ جملہ کا لطف اٹھا سکتے ہیں جن میں مرثیہ کا سوز بھی ہے اور غزل کی لطافت بھی ویسے تو مفتی صاحب کی رفاقت دارالعلوم دیوبند کے جلسہ شوری میں اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی میں حاصل ہوتی رہتی تھی لیکن اصلاً مفتی صاحب کی رفاقت اور وسیع و جامع معنی میں خدمت دین و ملت کے میدان ہیں ہم سفری کی سعادت ۱۹۶۲ء سے حاصل ہوئی۔

جب راولپنڈی، رانچی، جمشید پور کے فسادات نے ملت کا درو رکھنے والوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کو بھٹوڑ کر رکھ دیا اور یہ صاف نظر آنے لگا کہ اگر

بروقت اس کا مداوا نہ کیا گیا اور مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں، تنظیموں، اور ان کے قائدین رہنماؤں نے ملت ہی کو نہیں بلکہ ملک کو بچانے کے لئے منظم و متحد جدوجہد کا آغاز اور مشترک پلیٹ فارم کو وجود میں لانے کا کام نہ کیا تو اس ملت پر جو کچھ گزرے گی سو گزریگی ملک کی بھی خیریت نہیں، اس تناثر کا سب سے زیادہ غلبہ اور اس صدمہ کی چوٹ سب سے زیادہ (خدا مغفرت کرے اور ان کے درجے بلند کرے) ڈاکٹر سید محمود صاحب کے دل پر تھی، انھوں نے ان سب فکر مند اور درد مند حضرات سے رابطہ قائم کیا جو اس سلسلہ میں ان کے ہم سفر ہو سکتے تھے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے دہلی میں ہونے کی وجہ سے ان کا سب سے زیادہ اور پہلا ربط مفتی صاحب اور مولوی محمد سلم صاحب ایڈیٹر ”دعوت“ سے رہا، باہر کے لوگوں میں راقم سطور اور مولانا محمد منظور صاحب اس سلسلہ کا پہلا قدم مشاورت کا وہ تالیسی جلسہ تھا جو ۸، ۹، ۱۰ اگست ۱۹۶۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا، اور جس کے نتیجہ میں مسلم مجلس مشاورت وجود میں آئی، اسی جلسہ میں طے پایا کہ ملک کی فضا کو درست کرنے اور احترام انسانیت اور امن آشتی کا پیغام پہنچانے اور بجائے سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے (جن کے ذہن بہت کچھ مسموم ہو چکے ہیں) ملک کی عام آبادی اور ہندو مسلم عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کیا جائے، اس کے ساتھ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی جائے اور ان کو محسوس کرایا جائے، کہ وہ دین حق اور خدا کے آخری پیغام کے حامل انسانیت کے بے لوث خادم و معمار ہونے اور اپنی ان خصوصیات اور دینی ذمہ داریوں کی بنیاد پر اس ملک کے محافظ و پاسبان بھی ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلا سفر بہار و اڑیسہ کا ہوا، اور ایک مقرر اور متنوع الافراد وفد نے ستمبر ۱۹۶۴ء میں رانچی، چکر دھری پور، چائے باسہ، جھنڈ پور، اور راڈ کیلا کا دورہ کیا۔ ہر جگہ وفد کا شاندار اور پرجوش استقبال ہوا، مقرروں میں ڈاکٹر صاحب

کے بعد مفتی صاحب پیش پیش اور نمایاں ہوتے تھے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں مجلس نے ہمارا سفر کا دورہ کیا، دسمبر ۱۹۴۷ء میں گجرات کا دورہ ہوا۔ جہیں پنڈت سندر لال بھی شریک تھے اس سفر میں پالن پور، احمد آباد، نڈیاڈ، گودھرا، بڑودہ، سورت اور بھڑوچ پر یہ پروگرام اختتام کو پہنچا، گجرات کے دورہ کا ذکر آگیا ہے تو دو واقعات کے تذکرہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ احمد آباد کے قریب ایک مرکزی اور اہم قصبہ میں جس کا نام (اگر حافظہ کوتاہی نہیں کرتا) بیس نگر تھا، میں نے منتظین جلسہ اور رفعت سفر سے درخواست کی کہ چونکہ میں کئی راتوں سے دیر میں سو رہا ہوں اور بہت تھکا ہوا ہوں مجھے تقریر کا پہلے موقعہ دیدیا جائے، ذمہ داروں نے منظور کر لیا، اور پہلی تقریر میری ہوئی میں نے اس تقریر میں ہندوستان کی جغرافیائی وسعت، تاریخی عظمت اور سیاسی اہمیت وغیرہ بیان کرنے کے بعد ایک محب وطن ہندوستانی کی حیثیت سے اس پر حسرت و قلق کا اظہار کیا کہ اتنے عظیم ملک کی قیادت اور انتظام کے لئے ملک کے آزاد ہونے کے بعد جس بالغ سیاسی شعور، وسیع النظری، سیرت و اخلاق کی بلندی اور اصول پسندی کی ضرورت تھی، اسکی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے، شاید جنگ آزادی کی مصروفیت میں قومی سیرت و اخلاق کی تعمیر کا وہ کام نہیں ہو سکا، جس کی اتنے بڑے ملک کے سنبھالنے کیلئے ضرورت تھی، ملک میں ذہنی و اخلاقی انتشار، دولت کی حد سے بڑھی ہوئی محبت اور رشوت و کرپشن پھیلنا ہوا ہے، ملک کے بے لوث کارکنوں، سیاسی رہنماؤں، اور قائدین کو اسکی طرف توجہ کی ضرورت ہے، ورنہ اس آزادی کا برقرار رہنا مشکل ہو جائے گا میں یہ تقریر کر کے اپنی قیام گاہ پر آگیا، واپسی پر ملا جان صاحب نے بتایا (جو تحریک خلافت کے ایک پرانے کارکن اور مجلس مشاورت کے ایک اہم رکن تھے اور کلکتہ میں ان کا قیام تھا) کہ تمہاری تقریر پر پنڈت سندر لال جی نے سخت تنقید اور احتجاج کیا، اور کہا کہ مولانا کو اتنے

تند اور تیز لمبے میں ہندوستان پر تنقید کرنے کا کیا حق تھا؟ انھوں نے ملک کی توہین کی خیریت ہوئی کہ مجمع نے اس پر اپنے غم و غصہ کا اظہار نہیں کیا، مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ یہ باتیں ایک محب وطن ہندوستانی کے ناتے اور ملک کی خیر خواہی میں خلوص سے کہی گئی تھیں اس پر اتنا برا ماننے کی کیا بات تھی؟ فجر کی نماز کی تیاری کے لئے ہم سب لوگ اٹھے تو دیکھا کہ پنڈت جی اب بھی اس تقریر پر تنقید و تبصرہ کر رہے ہیں، اور مسلمانوں کے بارے میں طنزیہ الفاظ بھی استعمال کر رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ مسلمان زمزم کے مقدس پانی مانتے ہیں۔ لیکن گنگا جل کی انکے یہاں کوئی عزت نہیں، وغیرہ وغیرہ میں نے طے کر لیا کہ میں اخیر تک خاموش رہوں گا۔ تاکہ سفر کے مقصد کو کوئی نقصان نہ پہنچے، اور اس وفد میں جو مختلف الحیال لوگوں پر مشتمل ہے کوئی انتشار نہ پیدا ہو، لیکن حیرت ہوئی کہ رفقاء سفر میں سے جن میں بعض خالص مسلم جماعتوں کے رہنما تھے کوئی ایک لفظ نہیں بولا، اور پنڈت جی کا سلسلہ کلام جاری رہا، اتنے میں مفتی صاحب کی آواز آئی جو ابھی بیدار ہی ہو رہے تھے کہ پنڈت جی آخر مولانا نے کیا بے جا بات کہی آپ اتنے گرم کیوں ہیں؟ اس وقت مجھے مفتی صاحب کی قدر ہوئی کہ انھوں نے نہ صرف دینی حیثیت بلکہ اخلاقی جرأت سے کام لیا، اور میری تائید کی، پنڈت جی اس پر خاموش ہو گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

سفر گجرات کا دوسرا قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ بڑودہ میں نماز فجر وغیرہ سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے کہ چند اہل محلہ گھبرائے ہوئے آئے، اور انھوں نے کہا کہ قریب ہی ایک مکان ہے جو زمین میں دھنیں رہا ہے اس کے آثار نظر آتے ہیں کئی روز سے اس مکان کے مین خواب دیکھ رہے ہیں کہ اس مکان میں نامناسب کام ہوئے ہیں اور انکی

۱۔ اس موقع پر ڈاکٹر سید محمود صاحب صدر مجلس اور مولانا ابواللیث صاحب ندوی امیر جماعت اسلامی ہند موجود نہ تھے وہ دونوں احمد آباد رہ گئے تھے۔

نخواست سے یہ مکان زمین میں دھنس جائے گا، آپ حضرات چلیں اور وہاں دعا کریں ہم سب لوگ اپنی حقیقت سے واقف تھے ”ایاز قرنخو و راشناس“ لیکن یہ خیال ہوا کہ ملت کے خادموں اور مختلف مسلم جماعتوں کے نمائندوں کی جماعت ہے، اور یہ ایک نیک مقصد سے سفر کر رہے ہیں کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، اور یہ بلا ٹل جائے، کچھ نظر پڑتی تھی تو حضرت مفتی صاحب پر کہ عالم، حافظ، فقیہ اور اللہ کے ایک مقبول بندہ اور صاحب نسبت شیخ کے فرزند ہیں، ہم لوگ ہمت کر کے گئے اور وہاں کھڑے ہو کر دعا کی، اور چلے آئے، لوگوں نے بتایا کہ وہ کیفیت ختم ہو گئی۔ مکان اب بھی اسی حالت میں اس جگہ موجود ہے، محی غلام محمد مین صاحب (جن کا بڑا دورہ میں قیام ہے، اور مفتی صاحب سے خاص تعلق رکھتے ہیں) جب بھی پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ الحمد للہ مکان اپنی جگہ پر قائم اور محفوظ ہے۔ مشاورت کا سب سے بڑا دورہ ریاست میسور میں ہوا، جو ۱۱ نومبر سے شروع ہو کر ۲۲ نومبر ۱۹۶۶ء کو ختم ہوا۔ اسکی مجموعی نشست کا اندازہ ساڑھے چار ہزار میل ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت بس سے طے کی گئی۔ اس سے شروع ہو کر یہ دورہ گلبہرہ پر ختم ہوا، جہاں اسی ہی سے راقم السطور کی سفر میں فاق ہو گئی۔ یہ تحریک خلافت کے بعد شوکت اسلامی کا پہلا نظارہ تھا، اس کے اہم مقامات میں بنگلور، مرنگاپٹن (مدین سلطان میو) میسور، مرکارہ، منگلور، بانس، بیجا پور، شیموگا وغیرہ تھے۔ اس تاریخی دورہ میں اختتامی تقریر مفتی صاحب کی تھی، انہوں نے فرمایا کہ صحیح آزادی اور جمہوریت وہ ہوتی ہے جس کا فیض یکساں طور پر آبادی کے تمام عناصر اور ملک کے تمام فرقوں اور طبقوں کو پہونچے، اس کی انہوں نے مثالیں دیں، اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کو جو شکایات ہیں اس کا ذکر کیا، پھر اپنے پسندیدہ (جگر مورم) کے اشعار پڑھے، جو اس دورہ میں اکثر پڑھا کرتے تھے۔

بہار آئے اور اس شان کی بہار آئے کہ پھول ہی نہیں کانٹوں پہ بھی نکھار آئے